

مغرب اور اسلام کی کش مکش

ایک مغربی نقطہ نظر

پروفیسر عبدالقدیر سلیم

مغرب کی ایک خوبی کا اعتراف نہ کرنا، نادانی ہوگا۔ اپنے دوستوں کی طرح وہ اپنے حقیقی یا مزعومہ دشمنوں سے بھی (اپنے مخصوص زاویے سے) وابستگی رکھتے ہیں، اور ان پر گہری نظر بھی رکھتے ہیں۔ ۱۸ویں اور ۱۹ویں صدی میں مسلم دنیا کو فتح کر کے زیر نگیں لانے والے اہل مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جتنا کچھ لکھا، کیت کے اعتبار سے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ۲۰ویں اور اب ۲۱ویں صدی میں، جب کہ رُوح مغرب کی اسلام سے آویزش ایک نئی شکل اختیار کر گئی ہے، وہاں کی مجالس دانش (think tanks) اور دانش ور، پینترے بدل بدل کر اسلام سے نبرد آزما ہو رہے ہیں۔ ایسا ہی ایک مطالعہ زیدین میری بوتے کی کتاب *Islam's Fateful Path* (اسلام کی پُرخطر راہ) کی صورت میں سامنے آیا ہے جو پیش نظر ہے۔ بقول اسما افسر الدین (پیش نظر کتاب کی ایک مبصرہ)، جو یونیورسٹی آف نوٹرے ڈیم میں عربی اور اسلامیات کی استاد ہیں — مذکورہ بالا کتاب کے مصنف کی یہ کوشش قابلِ داد ہے کہ انھوں نے اسلامی روایات کے تنوع، رواداری، حقوق انسانی کی پاس داری، خواتین کے مرتبے اور مذہبی حریت کی طرف بھی اشارے کیے ہیں، جب کہ مسلم اور غیر مسلم، دونوں جانب کے انتہا پسند، مشترک اقدار اور پُر امن بقائے باہمی کو نظر انداز یا مسترد کرتے نظر آتے ہیں۔

○ پروفیسر کوکس انسٹی ٹیوٹ آف ایمرجنگ سائنسز اینڈ بزنس ایجوکیشن، کراچی

خود مصنف (ایک فرانسیسی عالم اور انٹرنیشنل کمیٹی آف دی ریڈ کراس کے سینئر لیگل کنسلٹنٹ) کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آیا اسلام، خوف، عدم برداشت، قسمت پر قناعت (fatalism)، دہشت گردی اور حقوق نسواں کے بارے میں حقارت و تردید کا مذہب ہے، یا اس کے برخلاف یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جسے غلط سمجھا گیا اور بدنام کیا گیا ہے۔ کیا مخالف مبصرین نے اس کے درست اخلاقی پیغام کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے؟ وجوہ سیاسی ہوں یا ذاتی (ص ۷۷)۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ کتاب کا ذیلی عنوان *The Critical Choices Facing Modern Muslims* (دور جدید کے مسلمانوں کے لیے پُرخطر ممکنہ راستے) مصنف کے نقطہ نظر کی غمازی کرتا نظر آتا ہے۔

مصنف کو اس بات کا شعور ہے اور ایک حد تک اعتراف بھی کہ مسلمان دانش ور جب یہ خیال کرتے ہیں کہ موجودہ دور میں نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد مغرب نے، مشرقی دنیا (خصوصاً مسلم دنیا) کو زیر نگین کرنے کے لیے ایک نئی حکمت عملی اپنائی ہے: اب فتوحات، ”روحانی اور معاشی میدان میں ہوں گی“۔ اور یہ خیال کچھ ایسا غلط بھی نہیں، بقول مصنف: یہ حکمت عملی کوئی نئی نہیں ہے۔ فرانس کے صلیبی جنگ جو شاہ لوی نہم (سینٹ لوی) نے ایک خفیہ دستاویز میں یہ اعتراف کرنے کے بعد کہ مسلمانوں کو جنگ کے ذریعے فتح کر لینا مشکل ہے، دوسرے حربوں سے کام لینے کی تلقین کی۔ لوی نہم کو ایک مقدس اور متبرک ہستی خیال کیا جاتا تھا۔ اس نے یروشلم سمیت مقامات مقدسہ کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، تاکہ انھیں ’بے دین کافروں‘ (مسلمانوں) کے ہاتھوں سے چھڑایا جاسکے۔ ۱۲۳۸ء میں اس نے مصر پر حملہ کیا۔ ناکام رہا، قیدی بنا اور بعد میں فدیہ دے کر رہا ہوا۔ دوسری کوشش میں کارٹیج (شمالی افریقہ) فتح کرنے کی مہم بھی ناکامی سے دوچار ہوئی۔ تاہم، مرنے سے پہلے اس نے اپنے ’مسلمان دشمنوں‘ کا قلع قمع کرنے کے لیے عیسائی بھائیوں کو وصیت کی کہ وہ مشرقی زبانیں سیکھیں، مسلم دینیات اور عقائد کا تنقیدی نقطہ نظر سے مطالعہ کریں، اور اس طرح تعلیم و تلقین کے ہتھیاروں سے اپنے دشمن کو صخر کریں۔ (ص ۳)

یوں ’مستشرقین‘ — عربی اور اسلامیات کے غیر ملکی، غیر مسلم ماہرین کا وہ گروہ پیدا ہوا، جس نے تحقیق اور تصنیف کے ذریعے اسلام کی بیخ کنی شروع کی۔ اگرچہ شروع ہی سے علما اور

مسلم دانش وروں نے ہمیشہ ان مستشرقین کی 'علمی کاوشوں' کو شک و شبہ ہی کی نظر سے دیکھا ہے، اور کبھی اسے قبول نہیں کیا۔ لیکن یہ کوشش جاری ہے، اور اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا کہ ایک طاقت ور عقیدے پر اس کے اندر گھس کر تخریبی کارروائی کی جائے۔

کیا یہ خیال 'مسلم بنیاد پرستوں' کا مزمومہ ہے؟ وہم ہے یا حقیقت؟ مصنف اس سلسلے میں دو ٹوک گفتگو نہیں کرتے۔ کبھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ مغرب کی اس 'سازش' کو بے نقاب کر رہے ہیں، اور کبھی وہ خود اس کا ایک حصہ اور ایک کردار نظر آتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ عیسائی مغرب کی اسلام سے اس خصامت کے اسباب کیا ہیں؟ مصنف کے نزدیک اس سوال کا جواب صدیوں کی تاریخ پر محیط ہے۔ لیکن صورت حال بہت واضح ہے: اسلام اپنی ابتدا ہی سے ایک طاقت ور، ساری دنیا پر چھا جانے کا عزم رکھنے والی ایک تحریک کے طور پر ظہور پذیر ہوا۔ ناقابل مزاحمت قوت کے ساتھ وہ کرۂ ارض پر پھیلنا چلا گیا۔ عیسائیوں، ایران کے ساسانیوں، ہندوؤں اور کنفیو شسیوں سے اس نے وسیع علاقے چھین لیے۔ اس کے پھیلنے کی رفتار اور نفوذ کی صلاحیت بھی اس نفرت کا ایک سبب ہے جو عالمی سطح پر صدیوں سے اسلام کے حصے میں آئی ہے۔ ان "تکست خوردہ اقوام میں عیسائی متاثرین وہ واحد قوم ہیں، جو محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] کو..... سمجھتے ہیں" [یہاں ایسے الفاظ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں لکھے گئے ہیں، جنہیں کوئی بد بخت اور شقی القلب بد دیانت ہی زیر قلم لا سکتا ہے] (ص ۴)۔ مغرب، اسلام کو ایک بے شعور، عقل سے کورا، قدامت پسند اور وحشیانہ مذہب گردانتا ہے، جو ایک دینی پاور بلاک کی حیثیت سے ساری دنیا پر اپنے غلبے کے لیے کوشاں ہے کہ یہ اسے اپنا حق سمجھتا ہے (ص ۴، ۵)۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے سے مسلم دنیا اور مغرب کی آویزش نے ایک نہایت تشددانہ صورت اختیار کر لی ہے، اور دونوں فریق ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ (ص ۵)

یہ ہے وہ مزمومہ پس منظر جس میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

اہل مغرب کو اس جنگ میں ایک اُمید افزا بات یہ نظر آتی ہے کہ خود مسلم دنیا بھی کوئی ایک مضبوط اکائی (monolithic block) نہیں رہی بلکہ اس میں 'بنیاد پرستوں' اور عقلیہ

(rationalists) — مراد روشن خیالوں — لادین اور اہل تصوف کے درمیان ایک پُر تشدد آویزش صاف نظر آتی ہے۔ پھر صدیوں سے شیعہ سنی، فلسفی، صوفی، روشن خیالی اور قدامت پسندی کی خلیجیں ہیں۔ مختلف مسلم ملکوں کے درمیان جھگڑے ہیں، جنہیں بڑھانے کی ضرورت ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس نوصیلیبی جنگ کا ادراک کر کے مسلمانوں کی وسیع اکثریت کے ذہن میں ایک رد عمل انگڑائی لے رہا ہے، اور وہ ہے 'اسلام کی طرف رجعت'۔

مصنف کے خیال میں اگر مسلم عوام کے خدشات دُور نہ کیے گئے، اور خصوصی کوشش کے ذریعے اُن کے دلوں میں اعتماد نہ پیدا کیا گیا، تو اسلام پسندی کا یہ چیلنج جو مغرب (اور ساری دنیا) کو درپیش ہے، ایک ایسا قلتِ بن جائے گا، جو پہلے تو مشرق وسطیٰ کو دھکائے گا اور پھر افریقہ، ایشیا، امریکا کے دونوں براعظموں اور جلد یا بدیر خود یورپ کو بھی اپنی پلیٹ میں لے لے گا۔ اس طرح آنے والے برسوں میں دہشت گردی اور مسلح تصادم عام ہو جائیں گے۔ مسلح جھڑپوں کے علاوہ اس جنگ کو بھڑکانے کے دوسرے ذرائع بھی اختیار کیے جائیں گے۔ بنیاد پرست مسلمان، ہتھیار سازی، خصوصاً کیمیائی، حیاتیاتی اور نیوکلیائی کی تیاری اور استعمال پر توجہ مرکوز کریں گے۔ (ص ۶)

ایک دوسرا خطرہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کا بھی ہے۔ جنوری ۲۰۰۰ء میں دنیا میں مسلمانوں کی تعداد اندازاً ڈیڑھ ارب سے کچھ اوپر تھی۔ مصنف کہتے ہیں کہ ”سی آئی اے کی کتاب حقائق“ (CIA Factbook) کے اندازے کے مطابق آبادی ایک ارب ۹۰ کروڑ ۲۰ لاکھ ۹۵ ہزار ہے (ص ۲۱۸)۔ مصنف نے بڑی تفصیل سے یورپی ممالک اور امریکا میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کا 'تشویش ناک' جائزہ لیا ہے۔ فرانس میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی نے پرنسٹنٹ عیسائیوں کی تعداد کو پیچھے چھوڑ دیا ہے (۵۰/۴۰ ہزار مسلمانوں کے مقابل ۱۷ لاکھ پرنسٹنٹ اور ۸ لاکھ یہودی) (ص ۷)۔ مسلم ملکوں میں آبادی ۶۴ فی صد سالانہ کی رفتار سے بڑھ رہی ہے (ص ۲۱۲)۔ اس پر مستزاد یہ کہ بہت سے اصلی نسلی یورپی بھی اسلام قبول کرتے جا رہے ہیں۔ (ص ۷)

مصنف کے خیال میں مغرب آج بھی اسلام کا مقابلہ کرنے کے لیے حسبِ سابق ترغیب و ترہیب دونوں کا استعمال کر رہا ہے۔ مسلم دنیا اور مسلم آبادیوں پر جارحیت کے ساتھ ساتھ

مسلمانوں کو سمجھنے سمجھانے کے لیے مستشرقین کے علاوہ ’اسلامیٹین‘ (ماہرین اسلامیات، Islamologists) کی ایک نئی کھیپ ظہور میں آئی ہے، جو مسلمانوں کا حلیہ بگاڑ کر انہیں اکثر مضحکہ خیز اور غیر انسانی ہیولوں میں پیش کرتے ہیں: یہ مسلمان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ سفاک اور ظالم، دغا باز، بے ایمان، منافق اور بددیانت و بدنہاد ہو (ص ۱۰)۔ ارنسٹ ریٹاں (Earnest Renan) نے مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کے بارے میں ایسے ہی بے ہودہ تعصب کا اظہار کیا تھا: سامی النسل لوگ عدم تجسس کا شکار ہوتے ہیں۔ اُن میں رواداری کا بھی فقدان ہوتا ہے، اور یہ لوگ فتنہ انگیز ہوتے ہیں۔ مداوا؟ اسلام کو تباہ کر دیا جائے۔ ریٹاں فرماتے ہیں: ”جنگ کا خاتمہ اُسی وقت ہوگا جب اسماعیل [علیہ السلام] کا آخری بیٹا یا تو مرجائے یا ریگستان کی پہنائیوں میں دھکیل دیا جائے“۔ (ص ۲۱۹، حاشیہ ۶)

ریٹاں کے پوتے ارنسٹ سچاری (Earnest Psichari) جنھوں نے عیسائیت کو ازسرنو دریافت کیا، فرماتے ہیں کہ ”جلد یا بدیر ہم مسلمانوں کو فتح کر لیں گے۔ ہم فاتح ہیں اور وہ فانی مفتوح۔ اور کیا درکار ہے؟“ (ص ۱۹۶)، جب کہ آگست پامل (August Pomel) کے خیال میں: ”محمدیت [اسلام] اُن معاشروں کے لیے تو ایک موزوں عقیدہ ہو سکتا ہے، جن کا سماجی ارتقا ایک وحشیانہ سطح پر آ کر رک گیا ہے۔۔۔ عرب معاشرہ اس کی موزوں مثال ہے۔۔۔ یہ [یعنی اسلامی] معاشرہ ۳ اقسام کے انسانوں پر مشتمل ہے۔ پہلی سطح پر زویل، منافق اور کاہل مذہبی زعما کا گروہ ہے، جس کے اثرات جہالت (مذہبی عصبیت) کی پیداوار ہیں۔ دوسرا گروہ پتو زدہ (flea bitten) اشرافیہ کا ہے جن کے نزدیک تعمیر اور پیدا آوری سرگرمیاں شجر ممنوعہ ہیں۔ احمقانہ اور تخریبی سرگرمیاں ان کے معزز مشاغل ہیں۔ تیسرا طبقہ غریب، مسکین ہاریوں کا ہے، جو مندرجہ بالا دو طبقات کو پالتے ہیں، اور خود فاقہ کشی میں یا خمس پر گزرا کرتے ہیں“ (ص ۱۹۷)۔ مسلمان ”وحشی و بچگانہ ذہن کے لوگ ہیں۔۔۔ جو اپنے شان دار ماضی کی جھوٹی یادوں اور مستقبل کے بے مصرف خوابوں پر زندہ رہتے ہیں“۔ (ص ۱۹۷)

مصنف کہتے ہیں کہ آج بھی مغرب کے تشدد و عیسائی خود کو اعلیٰ اور مسلمانوں کو ادنیٰ خیال کرتے ہیں، اور اُن کے نزدیک مسلمانوں کا نہ کوئی ضمیر ہے نہ اخلاقیات اور نہ عزت و وقعت۔ اپنی

انہی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے وہ مغرب کی اعلیٰ اقدار کے فہم سے عاجز ہیں۔ ان ”لرزتے، کانپتے غلاموں“ کے بالمقابل عیسائی اپنی سرشت کے اعتبار سے مختیر ہیں، اُس محبت کے امین، جو اُن کے اندر یسوع مسیح کے فیضان (grace) سے پیدا ہو گئی ہے۔ (ص ۱۹۶)

مصنف کے نزدیک قرونِ وسطیٰ سے انیسویں صدی تک کے مسلمانوں کے ہاں بھی یورپی اقوام کے لیے کوئی اچھی راے نہیں پائی جاتی اور آج بھی مغرب کے تسلط اور مزعومہ مظالم کے خلاف قدامت پسند اور عام مسلمانوں میں بھی، مغرب کے خلاف ایک نفرت واضح نظر آتی ہے۔ تاہم، ان کے خیال میں دنیا میں امن کے قیام کے لیے ”ثقافتی اور مذہبی عدم اعتماد اور نفرتوں کو ختم کرنے“ کی گنجائش ابھی موجود ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض مغربی علما نے مسلم فلاسفہ اور صوفیا پر تحقیقی کام کرتے ہوئے، مغربی تہذیب اور سائنس کو ان کا مہون منت بھی بتایا ہے، تاہم اکثریت نے اہل مغرب کے ذہن میں اسلام کا وہ تصور بٹھا دیا ہے، جس کی عکاسی، بقول ان کے: قدامت پسند ابن تیمیہ، محمد بن عبد الوہاب اور موجودہ سعودی حکمران کرتے ہیں۔ ۱۹ ویں، ۲۰ ویں صدی میں مسلم مفکرین میں مغرب پر تنقید اور اسلام کی طرف رجعت کا وہ عمل شروع ہوا، جس کی عکاسی ابوالاعلیٰ مودودی (جماعت اسلامی کے بانی)، حسن البنا (اخوان المسلمون کے بانی)، سید قطب اور بعض دوسرے مسلم مفکرین کرتے ہیں۔ بر عظیم کے علاوہ افریقہ کے کئی ملکوں، تیونس، مراکش، الجزائر وغیرہ میں ان مفکرین کی تحریروں سے متاثر ہو کر، اسلام کی طرف رجعت کی تحریکیں ابھریں۔ اُسامہ بن لادن کی تحریک، القاعدہ اور اسلامی جہاد کی تحریکیں اسی تھیو کریٹک اسلام (سیاسی اسلام) کی پیداوار ہیں۔

اسلام کی ایک دوسری صورت اور جہت، جس کی جڑیں مسلمانوں کے روشن ادوار میں ملتی ہیں ”وَسَبَّحُ الْمَشْرِقِيُّ، عقل دوستی اور روشن خیالی“ کا اسلام ہے، جس کے بیج معتزلہ، ابن رشد، ابن سینا، الخوارزمی، منصور بن حلاج، ابن عربی اور رومی نے ڈالے تھے۔ بعد میں جمال الدین افغانی اور محمد عبده نے اسے بازیافت کیا۔ زمانہ حال میں عبد اللہ بدوی (مصر) اور محمد الجبرئیل (مراکش) اس کے نمائندہ ہیں۔ لیکن قدامت پسند علما اور سیاست دان انھیں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ (ص ۱۲)

کتاب کے وسیع مباحث اسلام کی ابتدا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ اور

آپ کے مشن اور خلافت (راشدہ، بنو امیہ، بنو عباس) سے لے کر ۲۰ ویں صدی تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کتاب تین اجزا اور ایک اختتامیہ پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مصنف نے قبل اسلام عرب معاشرے کی حالت، حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت اور جزیرہ نما عرب میں پہلی مرتبہ ایک باقاعدہ ریاست کی سیاسی تشکیل پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور اکرم کی وفات کے بعد ہی اُمہ میں مستقل انتشار کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو بنو عباس کے برسرِ اقتدار آنے (۶۶۰ء) تک جاری رہا، یہاں تک کہ مرکزی 'اسلامی ریاست' پر بنو عباس قابض ہوئے (۷۵۰ء) اور تاتاریوں (منگول) کی یلغار (۱۲۵۸ء) تک برسرِ اقتدار رہے۔ وحشی تاتاریوں نے بنو عباس کو چن چن کر قتل کیا، مگر انھیں بغداد کی خلافت کی خواہش نہ تھی۔ خلافت کا ادارہ مصر اور پھر ترکی میں منتقل ہو گیا اور پھر مصطفیٰ کمال کے 'روشن خیال، جدیدیت' کے انقلاب کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا (۱۹۲۳ء)۔ اس طرح مسلم دنیا کی مرکزیت ختم ہو گئی۔ شرقِ اوسط چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ مگر اس سے پہلے ہی اُمتِ خوارج، شیعہ، اسماعیلی، دروزی، علوی اور زیدیہ میں منقسم ہو چکی تھی۔ اس پر مستزاد اسلامی تعلیمات اور قانون پر اختلافات جو اہل سنت کے چار علما کے مسالک (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل) کی شکل میں ظاہر ہو چکے تھے۔ معتزلہ، اشاعرہ اور صوفیہ کے درمیان غلیجیں الگ تھیں۔ ابن تیمیہ اور محمد بن عبد الوہاب نے 'سنتِ اسلام' کی طرف رجعت کی۔ انہی کے شاخسانوں میں 'رجعت پسند اور تنگ نظر' انتہا پسند نظریات بھی وجود میں آئے۔ سعودی عرب میں حکومت اور معاشرے پر ان کی فکر کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔

'عصری اسلامیت' کے خالق حسن البنا، سید قطب اور سید مودودی بتائے گئے ہیں۔ یہ رجحان ۱۹ ویں/۲۰ ویں صدی میں مغرب کے تعامل سے وجود میں آنے والے 'روشن خیال' اور 'رواداری' والے اسلام سے متصادم ہے۔ مصر کے حسن البنا نے اسلام کو زندگی کے ایک مکمل نظام کے طور پر پیش کیا۔ مثالی اسلامی ریاست قائم کرنے کے لیے ان کی حکمت عملی کے دو زاویے تھے: اسلامی تعلیم و تربیت اور عوام میں نئے سیاسی شعور کی بیداری۔ انھوں نے اخوان المسلمون کی تحریک برپا کر کے 'اُسرہ' (خاندان) کا نظام قائم کیا۔ مدارس، جامعات، مساجد، ہسپتالوں اور پیشہ وارانہ تنظیموں اور سرکاری سماجی خدمت کے اداروں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، اور مسلمانوں کو ایک

نیا نعرہ دیا: اللہ ہمارا مقصود ہے، رسول ہمارے قائد ہیں، قرآن ہمارا دستور ہے، جہاد ہمارا راستہ ہے، اور اللہ کی راہ میں شہادت ہماری اعلیٰ ترین خواہش اور تمنا ہے۔ اگرچہ مصر میں شاہ فاروق کے زمانے میں حسن البنا اور پھر انقلابی حکومت (جمال عبدالناصر) کے دور میں ان کے جانشین سید قطب کو شہید کر دیا گیا، اور اس جماعت پر پابندی اور مظالم کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا، تاہم آج بھی مصر میں اس کے زیر اثر ۶ ہزار مساجد ہیں اور جملۃ الشریعہ (ایک رفاہی تنظیم) کے ۲۰ لاکھ اراکین کام کر رہے ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی کو بھی مصنف ابن تیمیہ/محمد بن عبدالوہاب کے تشددانہ اسلام کا ایک جدید ایڈیشن گردانتے ہیں (ص ۶۸)۔ سید نے ۱۹۲۰ء سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ 'جماعت اسلامی' کے عنوان سے ایک تحریک برپا کی، آزاد خیالی اور لادینیت کے خلاف اور 'سلفی اسلام' کے حق میں علمی، عملی اور سیاسی میدان میں جہاد کیا (ص ۶۸-۸۰)۔

آزاد خیالی اور مغربی نظریات کے خلاف سید مودودی کی تحریک، جسے پڑھ لکھے نوجوانوں اور طلبہ میں بھی پذیرائی حاصل ہوئی، بڑی حد تک پُر امن تحریک تھی۔ تاہم ۲۰ ویں صدی کے وسط اور اواخر میں بین الاقوامی حالات، پہلی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست (۱۹۶۷ء)، لبنان کی خانہ جنگی (۹۰-۱۹۷۵ء)، ایرانی انقلاب (۷۹-۱۹۷۸ء)، سوویت یونین کے افغانستان پر قبضے کی مزاحمت (۹۲-۱۹۷۹ء)، پہلی خلیجی جنگ (۹۲-۱۹۹۱ء) اور حال ہی میں عراق اور افغانستان پر امریکی یلغار نے مسلم دنیا میں مغرب کے خلاف ایک عملی فساد اور نفرت، اور نتیجتاً کچھ عملی اقدامات کی طرف رجحان کو فروغ دیا ہے، جو بقول مصنف، ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کی صورت میں سامنے آئے ہیں، جب کہ امریکا پر براہ راست حملہ کیا گیا، خود کش حملہ آوروں نے اپنے جہاز ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون کی عمارتوں کو تباہ کرنے کے لیے استعمال کیے۔

اس قدامت پسند، 'سلفی' اور 'جہادی اسلام' کے خلاف اور بعض صورتوں میں اس کے متوازی دوسرے رجحان کی مصنف بار بار تکرار کرتے ہیں، جسے وہ 'عقلیہ' کا اسلام قرار دیتے ہیں۔ مصنف بار بار مسلم فلاسفہ اور دورِ جدید میں جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کا ذکر کرتے ہیں (وہ بر عظیم پاک و ہند کے مشہور فلاسفہ اور محدثین ہیں)۔

فراموش کر گئے ہیں)۔ جمال الدین افغانی (م: ۱۸۹۷ء) نے برطانوی استعمار کے خلاف آواز بلند کی اور ایک انقلابی کی حیثیت سے شہرت پائی، وہ ہندستان، مصر، روس، فرانس، ایران، برطانیہ اور ترکی میں گھومتے اور درسِ حریت دیتے پھرے۔ محمد عبدہ (م: ۱۹۰۵ء) بڑی حد تک جمال الدین افغانی کے ساتھی اور جدیدیت کے علم بردار تھے۔ انھوں نے اپنی سرکاری حیثیت (جج ۱۸۸۱ء، مفتی مصر ۱۸۹۱ء) میں بعض ایسے فتوے دیے جو قدامت پسند علما کو پسند نہ تھے۔ انھوں نے مصر کی جامعہ الازہر میں بھی بعض اصلاحات کیں اور عقل و روایت کے درمیان اختلاف کی صورت میں عقلی بنیاد پر فیصلے کرنے پر زور دیا۔ ساتھ ہی ان کے ہاں تصوف کی طرف میلان بھی پایا جاتا ہے: ”صوفیا میں بہت سے نبوت کے درجے کے قریب پہنچ جاتے ہیں، اور ماوراء کی ایک جزوی آگاہی بھی حاصل کر لیتے ہیں“ (ص ۱۵۶)۔ مصنف کو محمد عبدہ کی روشن خیالی، رواداری، انسان دوستی، سب کی بے لوث خدمت اور تمام مذاہب (خصوصاً اہل کتاب) کے لیے نرم گوشہ، اسلام کی سخت قدامت پسندی کے خلاف گفتار میں ایک مستحسن رجحان نظر آتا ہے۔

ضوابط میں جکڑے ہوئے، سخت گیر اسلام کے خلاف، مصنف تکرار کے ساتھ متصوفانہ نرم اسلام سے امیدیں وابستہ کرتے دکھائی دیتے ہیں جس نے عباسی عہد میں یونانی، یہودی اور عیسائی رہبانیت، ترک دنیا اور زُہد کے رجحانات کو فروغ دیا۔ اس رجحان کے نمائندے انھیں منصور حلاج، ابن عربی اور زوی نظر آتے ہیں۔ یہاں بھی مصنف مسلم تصوف کے اہم سلاسل قادریہ (شیخ عبدالقادر جیلانی، م: ۵۶۱ھ/۱۱۶۶ء) نقش بندیہ (خولجہ بہاء الدین نقش بند، م: ۷۹۱ء) اور مجددیہ (شیخ احمد سرہندی، م: ۱۶۲۳ء) کو فراموش کر دیتے ہیں، جو اسلام کے بنیادی عقائد، عبادات اور ضوابط کے سلسلے میں کسی بھی طرح کی مداخلت کے قائل نہیں۔ اُن کی اُمید اہل تصوف اور روادار، روشن خیالوں کے ایسے گروہ سے ہے جو رواداری، حریت، آزاد روی اور نرم کردار کے قائل ہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ حال ہی میں امریکا کی ایک مجلسِ دانش (Rand Corporation) نے خیال ظاہر کیا تھا کہ مسلمانوں کو جیتنے کے لیے اُن کے ہاں مروج ایک خاص نہج کے تصوف کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ (دی اکانومسٹ، ۲۰ دسمبر ۲۰۰۸ء)

اس کے علاوہ بھی کرنے کے اور بہت سے کام ہیں، جو مصنف کتاب کے اختتام میں تجویز

کرتے ہیں۔ اُن کے خیال میں اس کے لیے دوسروں کی اقدار کے لیے رواداری اور اعتماد کی فضا پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ عیسائی، یہودی، ہندو اور مسلمان مل کر ایک ضابطہ اخلاق مرتب کریں، ایک دوسرے پر حملے اور الزامات بند کریں۔ اقوام متحدہ، یونیسکو، ریڈ کراس، ریڈ کریسنٹ، یورپی یونین، افریقی یونین، آرگنائزیشن آف دی اسلامک کانفرنس، ایکو میکسکل کونسل آف چرچز اور دوسرے مل بینھیں، اور امن و آشتی کے لیے کوشش کریں۔ ایک اہم عملی بات: اسلامی تعلیمی اداروں میں یہودیوں کے پروٹوکول (Protocols of the Elders of Zion) کے حوالے دینے بند کیے جائیں کہ یہ یہودیوں کو بدنام کرنے والی ایک جعلی دستاویز ہے۔ تہذیبوں کے تصادم کا غلغلہ بند کیا جائے، اور عالمی مذہبی ڈپلومیسی کے زیر عنوان سارے فریق آپس کی دشمنی کو ختم کر کے باہمی رواداری اور احترام کا رویہ اپنائیں۔ مذہبی اور سیاسی قائدین مل بیٹھ کر اپنے لیے ایک ضابطہ عمل مرتب کریں۔ القاعدہ کو بھی شریک کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (ص ۶، ۲۰۰۵ء)

بیش تر مسلم ملکوں میں سرکاری اسکولوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے اور بہت سی مذہبی تنظیموں نے ایک متوازی نظام تعلیم قائم کر رکھا ہے، جو سرکاری کنٹرول سے آزاد ہے۔ مدارس، اذکار رفتہ تعلیم کے ذریعے ایک سمتی ذہن اور قدامت پرستی کو فروغ دے رہے ہیں۔ اس طرح وہ روشن خیالی کا استحصال کرتے ہیں۔ مذہب کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اسے اجتماعی زندگی سے متعلق اداروں کا استحصال کرتے ہیں، محنت اور معاشیات میں دخل اندازی سے روک دینا چاہیے (ص ۲۱۱)۔

فرد اور خواتین کے حقوق کی پاس داری کی جائے۔ مسلمانوں کی آبادی جو ۶.۴ فی صد سالانہ کے حساب سے بڑھ رہی ہے، اُسے روکنے کی ضرورت ہے، تاکہ مسلم دنیا میں معیار زندگی بلند ہو۔ 'اسلامیت' سے تیسری دنیا میں جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ان کی طرف توجہ دینا اشد ضروری ہے۔

اسلام کے لیے ایک غیر معاندانہ روش، لیکن اس کی اصل تعلیمات اور روح سے نابلد ذہن، اس دین اور اس کے وابستگان کو کس تناظر میں دیکھتا ہے۔ پیش نظر کتاب، اس کی ایک اچھی مثال ہے، یا ذہنی انجینیری کی ایک کوشش۔

(Islam's Fateful Path، اسلام کی پُرخطر راہ [مصنف: زیڈین میری بوتے

(Zidane Meriboute)، ناشر: I.B. Tanris، لندن، صفحات: ۲۳۶، قیمت: درج نہیں۔)